”اب باتیں ختم ہوگئی ہیں چاچا جی......باتوں کا اک وقت ہوتا ہے۔“

جب امید ختم ہو جائے تو پھر باتوں کی ضرورت نہیں رہتی۔انسان اپنے اندر جوگا رہ جاتا ہے“۔

میں اس کے حالات سے ناواقف تھا۔اسی بازار میں لان پر چلتا چلاتا جوگرز جینز اور بنیان میں ملبوس وہ کبھی کبھی مجھے ملتا اور سلام کرکے آگے نکل جاتا۔شاید وہ کسی پرانے گیراج میں کسی Basement میں غیر قانونی طور پر رہتا ہوں۔ہوسکتا ہے غریبی کا ستایا ہوا اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر یہاں پہنچا ہو۔شاید جوان بہنوں کی شادی، بیکار باپ کی مدد، بیمار ماں کے علاج نے اسے دیس نکالا دیا۔جوائنٹ فیملی سسٹم کے ضبط و نظم اور ذمہ داریوں نے اسے فرار کی یہ راہ سجھائی ہو۔اب یہاں وہ برسوں سے کسی چینی، ہندی، پاکستانی ترکی سٹور پر سامان ڈھوتے ڈھوتے تنہائی کاٹتے کاٹتے اس اداسی تک آپہنچا تھا جو اس کے چہرے پر کھنڈی تھی۔

شاید وہ بھی سوچتا رہتا ہو کہ وہ امریکہ میں کیوں ہے۔اس سوال کے جواب میں اس کے سر میں سٹارٹ نہ ہونے والی کار کی طرح گھیں گھیں بھاں بھاں کی آوازیں اٹھتی رہتی ہیں۔کئی یادیں غلیل کا پتھر بن کر اس کے ماتھے سے ٹکراتی ہوں اور اس میں اتنی ہمت بھی باقی نہ رہی ہو کہ وہ اپنا بچاؤ کرلے۔شاید وہ شوق کی بلندی اور ہمتوں کی پستی کا شکار ہو۔

میں نے اس کے کندھے پر پولا سا ہاتھ رکھا۔مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ مجھے قبول کرلے گا......

”چلو میں باتیں نہیں کروں گا۔صرف تمہارے پاس بیٹھا رہوں گا جیسے پلیٹ فارم پر دو سواریاں دیر تک ایک بنچ پر بیٹھتی رہتی ہیں“۔

اس کے چہرے پر اداس کے ساتھ ساتھ بڑی شرافت، بردباری اور حیا پھیلی ہوئی تھی۔

''اگر کوئی کام ہو تو مجھے بتا دیں میں کر دوں گا چاچا جی.....''

''بلکہ اگر تمہیں کوئی چیز درکار ہو تو بلا تکلف مجھے بتاؤ۔ میں کوشش کروں گا تمہاری مدد کی.....'' میں نے خوف کے باوجود اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے مدافعت نہیں کی۔

اسے نیند کا جھونکا آیا اور وہ کسی نشئی کی طرح جھول کھا گیا۔ پھر اپنے آپ کو قابو کرتے ہوئے بولا'' آپ سمجھتے ہوں گے کہ میں نشہ کرتا ہوں.....؟''

''میں نے تو ایسے نہیں سوچا'' میں نے جھوٹ کہا۔

''میں ڈیپریشن کا شکار ہوں..... یہ بیماری نہیں ہے اللہ کا ایک عذاب ہے..... کبھی وقتی ہوتا ہے، کبھی بار بار لوٹتا ہے، کبھی ہمہ وقتی ساتھی بن جاتا ہے۔ لوگوں پر تو اداسی کبھی کبھی نازل ہوتی ہے۔ اداسی اچھی چیز ہے چاچا جی..... اداس انسان کی شخصیت میں مٹھاس بھرتی ہے، لیکن ڈیپریشن انسان کو اپنی بے مائیگی، ناکارہ پن اور غیر اہم ہونے کا ایسا یقین دلاتا ہے کہ پھر اس کے لئے زندگی میں دلچسپی لینا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اداس آدمی احساس کمتری نہیں جاگتا اور ڈیپریشن میں سوائے احساس کمتری کے اور کوئی بات ہی نہیں ہوتی۔ یہ فرق ہے..... میں سوچتا ہوں جب'' میں اس قدر Worth Less ہوں تو جینے کا فائدہ..... میں مرنا چاہتا ہوں، لیکن ابھی تک زندہ ہوں۔ غصہ اور نفرت میرے اندر مسلسل کھولتے رہتے ہیں.....''

''حوصلہ کرو..... حوصلہ کرو بھائی میرے۔ یہ ان پردیس کی تنہائیوں کا اثر ہے.....''

''نہیں چاچا جی! ایسے نہیں ہے۔ میں اپنے دیس کے حالات سے بھاگ کر یہاں نہیں آیا..... بلکہ اس ڈیپریشن سے بچنے کے لئے میں نے یہ راستہ اختیار کیا تھا۔ بچپن میں اپنے گھر میں جزیرے کی طرح رہتا تھا۔ ہمارے گھر میں سب کچھ تھا، لیکن جذباتی ہم آہنگی نہیں تھی..... بچپن میں ہر وقت نقصان کا احساس رہتا تھا، لیکن جذباتی ہم آہنگی نہیں تھی..... بچپن میں ہر وقت نقصان کا احساس رہتا تھا، لیکن میں اس خسارے کے احساس کو کبھی زبان نہ دے سکا۔ ایک دن ہنسنا دوسرے دن رونا..... میرے موڈ

پنڈولیم کی طرح تھے..... لیکن جوانی کے آغاز میں یہ ہنسنا بھی رونے کا ہی روپ دھار گیا''۔

''میں جانتا ہوں۔ ڈیپریشن کیا ہے۔ Hippocrates نے سب سے پہلے Melancholia کا نام لے کر ڈیپریشن کی تشریح کی تھی۔ کبھی نیند نہ آنا، کبھی نشئی کی طرح سوئے ہی رہنا۔ کبھی بہت کھانا بالکل چھوڑ دینا'' میں انسان کی بدترین عادت سے نہ بچ سکا اور اس پر یہ ظاہر کرنے لگا کہ میں اس سے بہتر جانتا ہوں۔

شکر ہے اس نے میری بات کا نوٹس نہ لیا۔ ''چاچا جی سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ میں کسی چیز میں زیادہ عرصے تک دلچسپی نہیں لے سکتا۔ یہاں آکر میں نے کوئی دس بارہ Odd Jobs کیے ہیں۔ پہلے چند دن تو میں بڑا جوش روخش ظاہر کرتا ہوں۔ پھر متنفر ہو جانا میری عادت ہے..... چلو جی کام تک تو ٹھیک ہے، لیکن میں زیادہ دیر تک کسی سے محبت بھی نہیں کر سکتا۔ میرے اندر محبت اور نفرت کا عمل چکر میں چلتا ہے۔ میں جس قدر احساس کمتری کے تحت اپنے سے نفرت کرتا ہوں، اتنا ہی میں اپنے محبوب سے بھی اپنی ذات کی نفرت کے تحت ظلم کرتا ہوں..... میں نے اپنے ماں باپ کو بڑے دکھ دیئے ہیں۔ چاچا جی سوچتا ہوں تو کانپ جاتا ہوں۔ میرا خیال تھا کہ ان ہی کی بدولت میری تعلیم ادھوری رہی۔ وہی مجھے ڈسپلن نہ کر سکے۔ ان کی بدولت مجھے فوکس ہونے کا موقع نہ ملا۔ میں اپنی عادات میں منظم نہ ہو سکا۔ میں ذہنی طور پر اتنا ڈیپریشن کا شکار ہو گیا۔ چاچا جی..... کہ مجھے اپنے سوائے نہ کسی کا خیال رہا، نہ میں اپنے احساس کمتری کے باعث کسی اور کا خیال رکھ سکا.....''

''ڈیپریشن بیماری نہیں ہے حالت ہے..... یہ کبھی کبھی راتوں رات غائب جاتی ہے۔ کبھی سائیکوتھیراپی Bsychoanalysis اور ڈرگز سے بھی کچھ فائدہ نہیں .....''

''اس لئے کہ یہ بیماری نہیں چاچا عذاب ہے..... عذاب الٰہی، آپ کو معلوم ہے کہ

یہ بیماری کیوں ہوتی ہے۔"

"کہتے ہیں کہ بچپن میں سن بلوغت میں اگر جذباتی ہم آہنگی میسر نہ آئے تو ڈیپریشن ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی اس عمر میں احساس نہیں ہوتا، لیکن بیماری کا بیج بویا جا چکا ہوتا ہے ....."

"یہ وجہ ڈاکٹر لوگ بیان کرتے ہیں، لیکن ایک وجہ مجھے اور بھی معلوم ہو گئی ہے چاچا جی وقت کے ساتھ ..... تجربے کے ساتھ ..... ڈیپریشن ناشکر گزاری کی قلبی بیماری ہے ..... کچھ لوغم سے سمجھوتہ کہتے ہیں۔ ڈیپریشن والا اپنے آپ کو غم کے سیاہ گھوڑے پر سوار نہیں ہونے دیتا۔ اس کا پاؤں رکاب میں پھنسا رہتا ہے اور وہ گھسٹتا چلا جاتا ہے، رگیدا جاتا ہے ..... اور سوار اس لئے نہیں ہو پاتا کہ وہ غم کے سیاہ گھوڑے کا کبھی شکر گزار نہیں ہو پاتا۔ اسے کبھی علم ہی نہیں ہو سکتا کہ غم اس کے امکانات کو ابھارنے، اسے بہتر انسان بنانے کے لئے آیا تھا ..... میری ماں تو جلد فوٹ ہو گئی تھی، لیکن میں نے اپنے باپ کو بڑے دکھ دیئے چاچا جی ..... اولاد کو جو آزمائش کہا گیا ہے تو اس کی ایک ہی وجہ ہے۔ وہ والدین کی شکر گزاری نہیں ہوتی ..... وہ والدین کی ساری محنتوں، قربانیوں، انتظاروں کا صلہ ناشکر گزار ہو کر دیتی ہے ....."

"چلو چل کر کافی پیتے ہیں آؤ چلو ..... یوں اپنے دل پر بوجھ ڈالنے سے حاصل؟ کبھی ماضی کو پھرولتے رہنے سے بھی کچھ ملا ....."

"شاید مل جائے کوئی سبق ..... کوئی راستہ ..... چاچا جی میرے باپ نے بڑی محنت کر کے فیروز پور روڈ پر ایک پلازہ بنایا تھا۔ ہم لوگ اچھرہ میں رہتے تھے۔ میرے باپ کا اتنا بڑا دل تھا کہ ہمارا گھر شہد کے چھتے کی طرح بھنبھناتا رہتا۔ گاؤں سے مقدمے لڑنے والے دیہاتی رشتہ دار ..... بیوہ غریب عورتیں ..... تعلیم کے سلسلے میں ٹھہرے ہوئے نوجوان، شادی کی تیاری کرنیوالی شانگ شانگ پکارنے والی لڑکیاں ..... اقرباء کا ایک ہجوم پلتا تھا ہمارے تین منزلہ مکان میں ..... جب دوسری

بار بی اے میں میری کمپارٹ آئی تو میں ڈیپریشن کے شدید دور سے گزرا۔ کئی مرتبہ تو میں اپنے مستقبل، اپنی ذات، اپنے حالات سے اس درجہ مایوس ہو جاتا کہ مجھے اپنی زندگی مکمل طور پر بیکار لگتی۔ میں سنجیدگی کے ساتھ خودکشی کے متعلق سوچتا رہتا۔ کبھی ٹرین کے نیچے آنے کا منصوبہ، کبھی زہر کھا لینے کا تصور..... کبھی مینار پاکستان سے چھلانگ لگانے کی خواہش سوچتے جاگتے میرا تعاقب کرتی..... چاچا جی جانتے ہیں روز ازل اللہ اور ابلیس کے درمیان کیا معاہدہ ہوا تھا..... اللہ نے ابلیس کو قیامت تک کس چیز کی مہلت دی تھی....."

مجھے اس نوجوان میں بڑی کشش محسوس ہوئی۔ وہ بڑا ذہین، جان دار اور سوچنے والا جوان تھا جو اپنے متعدد سوالوں کے بدلے صرف ایک شافی جواب کی تلاش میں تھا۔

"میں وہاں موجود نہیں تھا۔ میرے بیٹے..... بائی دی وے تمہارا نام کیا ہے....."

"میرے جیسے روندے ہوئے پامال لوگوں کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ ہم عمارتوں کا ملبہ ہوتے ہیں۔ نہروں میں نیچے بیٹھ رہنے والا گارا ہوتے ہیں۔ ہم سڑکوں پر اڑنے والے پلاسٹک کے وہ لفافے ہوتے ہیں جو پھٹ جاتے ہیں اور جو کوئی چیز سنبھالنے کے کام نہیں آتے..... آپ مجھے مسٹر جنک پکار لیا کریں چاچا جی....."

"تم تو کارنیشن کا پھول ہو بھائی میاں..... خوبصورت اور خوشبو دار۔ میں تمہیں مسٹر جنک کیسے پکار سکتا ہوں؟"

"جو شخص اللہ کی رحمت سے مایوس ہو وہ بیکار نہیں تو اور کیا ہے؟ آپ جانتے ہیں انسان کو مایوس کون کرتا ہے اور کیسے کرتا ہے....."

"ناں بھائی میرے ایسی گہری باتیں نہیں سوچا کرتا میں....."

مسٹر جنک نے کہا..... "سنیے چاچا جی! جب ابلیس نے حضرت آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تو ابلیس نے دعویٰ کیا کہ وہ انسان کو بہکائے گا اور اسے اللہ کی رحمت سے مایوس کرے گا۔ باری تعالیٰ نے ابلیس کو روز قیامت تک مہلت دی..... ابلیس نے

دعویٰ کیا کہ وہ انسان کو اغواء کرنے میں کامیاب ہوگا.....''

میں نے ہنس کر کہا..... ''بھائی میرے اللہ کے سامنے کیسا دعویٰ۔ یہ تو بھول تھی ابلیس کی۔

''آپ جانتے ہیں چاچا جی! ابلیس کا دعویٰ بے بنیاد نہیں تھا۔ وہ اماں حوا کو بہکانے میں کامیاب رہا..... پتہ ہے ابلیس کیا کرتا ہے..... اس کی کارروائی کا کیا طریقہ ہے؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''چاچا جی! ابلیس انسان کے نفس سے ساز باز کرتا ہے۔ نفس میں امنگ، خواہش، ضرورت کو جگاتا ہے۔ جس قدر خواہش ناممکن ہوگی، اسی قدر ابلیس اسے عین ممکن کر کے دکھائے گا۔ نفس اس قدر غالب آجائے گا کہ وہ پورے انسان کو بڑے کنویں جھنکوائے گا۔ کبھی پیروں، فقیروں کے پیچھے، کبھی مزاروں کے طواف، کبھی اللہ کی حضوری میں انسان اپنی خواہش کی عرضی ڈالے گا، جوں جوں خواہش کے پورا ہونے کے امکانات کم ہوتے ہیں، انسان اللہ کی رحمت سے مایوس ہوتا جائے گا..... دولت کی ہوس، نام و نمود کی خواہش، عورت کا آزاد، ایک کارخانہ کھلا ہے نفس کے اندر..... وہ امید دلا دلا کر..... کوشش پر آمادہ کر کے خواہش کے جال میں جکڑ کر انسان کو اللہ کی رحمت سے مایوس کرتا ہے..... اور جونہی انسان اللہ سے مایوس ہونے لگتا ہے۔ ابلیس اغواء کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پتہ نہیں انسان کے قلب پر کیا گزرتی ہے ایسے میں''۔

''بھائی تو مجھ سے بڑی پڑھی لکھی باتیں کر رہا ہے..... میں ٹوٹا پھوٹا شاعر ضرور ہوں، لیکن میں نے کبھی ایسی باتیں نہیں سوچیں..... میں تو ساری عمر میں بزنس کی ایک معمولی ریپئر شاپ سے چل کر امپورٹ ایکسپورٹ کے کام تک پہنچا ہوں۔ فریج، ایئر کنڈیشنر، الیکٹرک سامان امپورٹ کیا کرتا تھا میں..... جب سے میرے

دونوں بچے امریکہ آ گئے، اس کام کی بھی چنداں ضرورت نہیں رہی تھی.....''

وہ عام ڈیپریشن کے مریض کی طرح میری بات نہیں سن رہا تھا۔ یقیناً وہ اپنے ہی اندر کہیں گھسن گھیریاں کھا رہا تھا۔

''جب انسان اللہ کی رحمت سے مایوس ہوتا ہے، امید مرجھانے لگتی ہے تو چاچا جی انسان کے اندر پہلے تو کھلبلی مچتی ہے، پھر وہ حدیث نفس کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایسے میں وہ اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتا ہے۔ اس کا نفس اور وہ خود مکالمہ کرتے رہتے ہیں۔ رفتہ رفتہ ان لوگوں کے خلاف باتیں دل میں ابلنے لگتی ہیں۔ جن سے وہ محبت کا اعتراف کیا کرتا ہے، ہولے ہولے جب حدیث نفس پختہ ہو جاتی ہے، تلاوت الوجود کی عادت پڑ جاتی ہے تو اللہ کے برگزیدہ لوگوں کے خلاف بھی نعوذ باللہ منفی باتیں سوچنے کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر زیادہ وقت گزر جائے تو اندر سے طعنے، گالیاں، منفی سوچ کی بوچھاڑ اللہ پر ہونے لگتی ہے۔ جس نے اس کی خواہش پوری نہ کی اور اسے مایوسی کے حوالے کر دیا۔ عام انسان کے دل میں بھی محبت اور نفرت کا جذبہ بیک وقت کسی شخص کے لئے موجزن ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے۔ وہ نارمل ہونے کی وجہ سے نفرت پر قابو پا لیتا ہے، لیکن ڈیپریشن والے کی مایوسی اسے محبت کرنے ہی نہیں دیتی۔ میرے باپ نے میرے لئے اتنا کیا..... اتنا کیا میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں انجینئر بنوں..... پیسے کی کوئی کمی نہ تھی۔ میں ذہین تھا، لیکن میں نے باپ سے نفرت کی وجہ سے پڑھائی کی طرف توجہ نہ دی۔ میرا نفس مجھے اس بات پر آمادہ رکھتا کہ میں بغیر پڑھے فسٹ ڈویژن حاصل کر سکتا ہوں۔ میں معجزے کا منتظر تھا..... دوبار جب میری انگریزی میں کمپارٹ آئی تو میں نے اس شکست کا سارا بوجھ الزام کی شکل میں اپنے باپ پر ڈال دیا..... مجھے جو احساس جرم ستاتا، میں اس کی وجہ اپنے باپ کو سمجھتا۔ میں اسے طعنے اور کچوکے لگاتا کہ اس نے ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کی مدد کی اور میری جانب سے بے توجہی برتی..... اماں تو خیر بہت پہلے فوت ہو گئی تھیں، ورنہ

میں انہیں خود اپنے ہاتھوں قتل کر ڈالتا۔ میں ناکامی، منفی سوچ، احساس جرم اور محرومی کو اپنے والدین کیسر تھوپتا رہتا..... میرا خیال تھا کہ ان دونوں نے گھر کو ہوٹل میں تبدیل کر کے اپنی ذمہ داری نہ نبھائی تھی۔ ان پر سارا الزام ڈالنے کی وجہ سے Catharsis تو ہو جاتا لیکن حدیث نفس کم نہ ہوتی۔"

"ہو جاتا ہے..... ہو جاتا ہے انسان کی زندگی ہو جانیکی ہی تو منتظر رہتی ہے....."

"چاچا جی..... پھر ایک واقعہ ہو گیا۔ میرا ایک دوست امریکہ چلا آیا۔ اس کا نام لاٹری میں نکل آیا تھا۔ جونہی وحید امریکہ پہنچا، اس نے مجھے اکسانا شروع کر دیا کہ یہ مواقع کا ملک ہے۔ کسی ایجنسی سے امیگریشن کا چکر چلا کر فوراً پہنچو..... میں نے بڑی تگ و دو کی۔ میرے باپ نے چار پانچ لاکھ روپیہ مجھے دیا۔ میں ایک لمحہ کے لئے بھی اس کا شکر گزار نہ ہوا..... امریکہ پہنچا تو کچھ دیر تو وحید نے اعانت کی، لیکن یہاں کسی کی بیساکھی بننے کا رواج نہیں۔ میں نے لاہور میں کبھی غریبی کا مزہ نہ چکھا تھا، آرام دہ زندگی کا عادی تھا..... یہاں آ کر پتہ چلا کہ جو میری Face Value ہے وہی چلے گی، دس کا نوٹ ہزار کی کرنسی شمار نہیں ہوتا..... یہاں آ کر حدیث نفس پہلے سے زیادہ ہو گئی..... سٹوروں پر کام کیا، پٹرول پمپ پر گاڑیوں میں پٹرول بھرے..... دو تین ہوٹلوں میں بیرا گیری کی..... ٹیکسی چلائی، لیکن کبھی باپ سے رابطہ نہ کیا..... میں نے اپنے متعلق جس احساس کمتری کو اندر پال رکھا تھا۔ ہر پرانے کام کو چھوتے وقت نئے کام کو حاصل کرتے ہوئے اس کی تصدیق ہوتی رہی۔ میں اپنے آپ سے کہتا یہی تیری اوقات ہے۔ وحید اس دوران سوفٹ ویئر کی دکان بنا چکا ہے، میں اس کے دائرہ احباب میں نہیں ہوں۔ اس بات کا بھی دل کو رنج رہتا ہے، کیونکہ لاہور میں وہ ہمارے کوٹھے پر مجھ سے مانگ مانگ کر پتنگیں اڑایا کرتا تھا۔ اب میری بس ہو گئی ہے۔ چاچا جی اب میں اور زیادہ نہیں لے سکتا..... وطن کی مٹی مجھے راس نہیں آئی اور امریکہ کی ہواؤں میں اڑنا میرے لئے ممکن نہیں..... آپ نے پوچھا تو بتا دیا ورنہ..... اب تو

مجھے کسی سے بات کیے بھی ہفتے گزر جاتے ہیں۔"

"پیارے بیٹے جہاں تک تمہاری باتوں سے میں اندازہ لگا سکا ہوں..... یہ تمہاری بیماری نہیں، صرف قلب کی حالت کا بیان ہے اور قلب کچھ بیماریوں کا شکار ہوا کرتا ہے۔ شرک، ناشکر گزاری اور تکبیر، بلکہ یوں سمجھو تکبر ہی ناشکر گزاری کو جنم دیتا ہے۔ اگر ترقی والوں کی مدد سے اس کا علاج کرو گیتو گولیاں پھانکو گے۔ کبھی سائیکو Psychoalysis کراؤ گے، کبھی سائیکو تھریسٹ کے پاس جاؤ گے۔"

"جاتا رہتا ہوں جی....."

"ایک علاج فلاح والوں کا بھی آزما دیکھو..... اپنے قلب کو ذکر اللہ کے حوالے کرو ..... اللہ کے ذکر کے علاوہ اطمینان قلب ممکن نہیں....."

"حدیث نفس ختم ہو جائے گی۔ میرے اندر کی منفی سوچیں جنہوں نے مجھے پاگل کر دیا، ہے کیا کیا کیا۔ یہ میرا پیچھا چھوڑ دیں گی؟" مسٹر جنک نے سوال کیا۔

یہاں اسلامک سنٹر میں نائیجیریا کے ایک صوفی جمعرات کی شام کو ذکر کی محفل گرم کراتے ہیں۔ پاس انفاس سکھاتے ..... وہاں پہنچ جانا.....

"آپ وہاں جاتے ہیں چاچا جی۔"

"ہاں کبھی کبھار..... لیکن تم ضرور جانا..... تمہیں فلاحی ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا..... میں نیاس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں دبایا اور آہستہ سے پوچھا "اپنے چاچا جی کو نام نہیں بتاؤ گے اپنا....."

اس کی آنکھوں میں لمحہ بھر کے لئے امید کی چمک آئی۔

"احمد..... پتہ نہیں یہ نام میرے گدھے باپ نے کیوں رکھ دیا؟"

گزبو کی جانب چلتے ہوئے مجھے اس آدمی کی کہانی یاد آئی جو ہمیشہ نفع کا عادی رہا اور کبھی نقصان کے راستے پر نہ چلا۔ ایک دنیا دار ہمہ وقت پریشان رہا کرتا تھا۔ طمانیت قلب اس سے کوسوں دور تھی۔ راحت اور عافیت کو ترستا رہتا۔ ایک روز صبح دم اٹھا تو

دل میں خیال گزرا کہ اگر میرے مسائل طے ہو جائیں اور میں اطمینان قلب کو پہنچوں تو میں اپنا محل نما گھر بیچ دوں گا اور اس سے جو حاصل ہوگا وہ راہ مولیٰ خیرات کر دوں گا..... کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ اس کے مسائل ختم ہو گئے اور وہ چین سے سونے لگا۔ اب قسم یاد آئی، لیکن دل میں معاً حرص جاگی۔ اس نے سوچا محل بیچ کر جو خطیر رقم حاصل ہوگی، وہ تو غربا میں تقسیم کرنا حماقت ہوگی۔ معاً اس نے اپنے بچاؤ کے لئے ترکیب سوچی۔ گھر کے آگے سیل کا جو بورڈ لگایا۔ اس پر رقم کیا کہ یہ گھر ایک روپے میں قابل فروخت ہے، لیکن اس کے ساتھ ایک بلی بھی خریدنا ہوگی جو اس گھر کی مکین ہے۔ بلی کی قیمت علیحدہ بتائی جائے گی۔

ایک گاہک نے مکان اور بلی کو اس طرح خریدا کہ حویلی کا دام تو ایک روپیہ تھا، لیکن اس میں بسنے والی بلی کی قیمت ایک لاکھ روپیہ تھی۔ مکان سے حاصل ہونے والا روپیہ تو مالک مکان نے خیرات کر دیا اور بلی سے حاصل شدہ رقم چونکہ وعدے میں شامل نہ تھی، اس لئے اسے اپنے لئے مختص کر لیا..... سنا ہے کچھ دیر بعد وہ پھر راتوں کو جاگنے لگا اور راحت، عافیت، اطمینان اس سے کوسوں دور ہو گئے..... ہمیہ اپنے فائدے کے متعلق سوچتے رہنے والوں کا انجام ان کے فیصلوں میں چھپا رہتا ہے..... وہ نفع کے عادی ہونے کے باعث فلاح کو پا نہیں سکتے۔

میں پھر اپنی پرانی سوچ کی طرف لوٹتا ہوں۔

اگر آپ غور سے امریکی معاشرے کا جائزہ لیں تو آپ بھی غالباً اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ امریکی معاشرہ اینٹی کرائسٹ نہیں ہے۔ جہاں تک مذہبی رسوم پرستی کا تعلق ہے، وہ ابھی بھی پورے زور و شور سے کرسمس اور ایسٹر مناتے ہیں۔ اربوں ڈالروں کی تجارت کرسمس کے تہوار سے وابستہ ہے، لیکن وہ اندر سے حضرت عیسیٰ کو نہیں ان کی تعلیم کو رد کر چکے ہیں۔ ان کے لئے محبت کا مفہوم ڈالر کی آندھی میں خس و خاشاک کی طرح کھو ہو گیا ہے۔ اب امریکی معاشرہ اینٹی کرائسٹ نہیں، اینٹی لو معاشرہ ہے۔ جس

طرح مسلمانوں نیا پنے معاشروں سے اسلام کے بنیادی تصور عدل کو نکال پھینکا ہے۔ کسی بھی اسلامی ملک میں کہیں بھی مساوات پریکٹس نہیں کی جاتی۔ ایسے ہی امریکی اب پرسنل محبت کی جگہ یونیورسل ہمدردی کے گاہک ہے۔ عیسائیت کی یہ روح تھی کہ کوئی تمہارے ایک گال پر تھپڑ مارے تو اسے دوسری گال پیش کر دو۔ اپنے ہمسائے سے ایسی محبت کرو جیسی تم اپنے آپ سے کرتے ہو اپنے نیگرو ہمسائے پر Peoples Court میں یہ مقدمہ دائر نہ کرو کہ وہ گھاس نہیں کاٹتا اور آپ کے گھر کی قیمت نہیں بڑھ سکتی۔ بس وہ آپ کا ہمسایہ ہے اور ہمسائے سے محبت عیسائیت کا جوہر ہے۔

یہاں ایک مغالطہ پیدا ہوسکتا ہے کہ شاید امریکی معاشرہ کسی چالاکی سے براؤن، سیاہ، چپٹی ناک والے اور دوسرے نسلی اختلافات رکھنے والوں سے فاصلہ قائم رکھتا ہے۔ اس مغالطے سے بھی نکلنے کی ضرورت ہے۔ یہاں آپ کو اللہ ترس، ہمدرد لوگوں کی بھی ایسی کھیپ ملے گی جو بے شمار رفاہی کاموں میں مشغول ہیں اور اپنی آمنی کا معتد بہ حصہ خیراتی کاموں میں لگاتے ہیں، لیکن یہ ہمدردی کا جذبہ محبت نوع کی چیز سے ذرا مختلف ہے۔ سفید فام لوگوں کا امریکی معاشرہ Impersonal ہمدردی کرتا ہے۔ وہ جذباتی طور پر ایسے کاموں میں مبتلا نہیں ہوتا جو اس کے دل پر دستک دیں اور اسے غم آشنا زندگی کے حوالے کر دیں۔ سفید فام لوگ فیصلہ کر چکے ہیں کہ غیر شخصی ہمدردی تو مصروف زندگی کے ساتھ، متعصب خیالات کے ساتھ ساتھ ممکن ہے، لیکن پڑوسی سے ویسی ہی محبت کرنا جیسی اپنی ذات سے ہو ترقی کے راستے پر ممکن نہیں، کیونکہ ترقی کام کی پجارن ہے، انسان کی متلاشی نہیں۔

کام کے لئے سب سے بڑی اہمیت وقت کی ہ۔ کام کر آدمی وقت ضائع نہیں کر سکتا اور انسان کی کھوج کسی نئے برصغیر کو تلاش کرنے کے برابر ہے۔ تلاش میں وقت ضائع ہوا ہی کرتا ہے، چونکہ کوئی انسان بھی وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ اس لئے اپنے سے کم

تر لوگوں کو Human Rights تو دیئے جا سکتے ہیں، ان سے محبت نہیں کی جاسکتی۔ اپنے سے احقر محبت کے قابل نہیں ٹھہرتا ..... اسی مشکل نے امریکی معاشرے میں ایک خاص قسم کی ٹیڑھ پیدا کردی ہے۔ پرائیویسی، فاصلے اور رشتوں کی زبوں حالی کو جنم دیا ہے۔

ساندہ سے نکل کر ہم نے ٹمپل روڈ پر ایک مکان ذرا سا اندر کی جانب الاٹ کرالیا تھا۔ یہاں ہی پہنچ کر دادی کو شوگر کا عارضہ ہوا اور ابا جی ہم سے رخصت ہو گئے۔ شاہد بھائی نے ہال روڈ پر بہت پہلے ایک دکان میں ریپیئر کا کام شروع کر دیا۔ شاہد بھائی جز وقتی شاعر تو تھے، لیکن شادی کے بعد ہمہ وقت سیدھے سادے مستری بن گئے۔ ان کی دیکھا دیکھی پتہ نہیں کیسے اور کیوں میں بھی شاعری کرنے لگا۔ شاہد بھائی کا اصرار تھا کہ میں بی اے کرنے کے بعد ان کے ساتھ دوکان پر بیٹھوں اور ٹانکے لگانے اور مرمت کرنے کا علم سیکھوں۔

ان دنوں آپیا کی شادی تھی اور اس کی تیاریوں میں ان کی من چاہی سہیلی اقبال ہمارے گھر آیا کرتی تھی۔ اقبال جیل روڈ پر رہتی تھی اور اس کی سفید موریں کا ہم پر بہت رعب تھا۔

اقبال کا رنگ بھی ایسا تھا کہ کبھی امریکن لگتی کبھی ہسپانوی..... کبھی اس کے گال سرخا سرخ ہوتے، کبھی زرد خوبانی جیسے۔ اس کے جسم میں لہروں والے ہلکورے پنہاں تھے جب بھی چلتی یوں لگتا انسان نہیں پانی کی لہر ہے..... میں اپنے ساحل کو اس لہر کے ٹکراؤ سے بچانا چاہتا تھا، لیکن آپیا کی شادی ایک مرحلہ وار عمل تھا۔ اقبال اور آپیا قریباً روز سفید مارس پرانا کلی جاتیں۔ پھر کسیرے بازار سے برتن آتے۔ زیورات کی جانچ پڑتال کے لئے ڈبی بازار بھی جانا پڑتا۔ اقبال عمر میں آپیا سے بہت چھوٹی تھی۔ پھر بھی دوستی جاری تھی اور اس کی لپیٹ میں شاہد بھائی اور میں دونوں آئے ہوئے تھے۔ اس روز وہ کھڑکی میں بیٹھی ٹانگیں جھلا رہی تھیں۔ آپیا غسل خانے میں تھیں۔ باہر

املتاس کے درخت پر کوئل کوک رہی تھی۔ میں اپنی غزل سنانے کے لئے آپیا کے پاس پہنچا۔ان دنوں میں شاہد بھائی کا نقل چوتھا۔جو کچھ میرے اس رورل ماڈل کو کرنا ہوتا مجھ پر حکم ہو جاتا تھا۔

آپیا کہاں ہیں۔میں نے سوال کیا۔

ابھی نہانے گئی ہیں۔اقبال نے جواب دیا۔

اچھا..... میں چلتا ہوں۔

بیٹھ جایئے۔نکلنے والی ہیں۔

میں انہیں اپنی غزل سنانے آیا تھا۔

وہ کھڑکی کی سل سے اتر آئی۔بلی کی سی سبک پائی کے ساتھ

مجھے سنانا پسند کریں گے اپنی غزل.....

اس زمانے میں ایکٹرس راگنی کی آنکھوں کا بڑا چرچا تھا۔اقبال کی بڑی بڑی غزالی آنکھوں کے پپوٹے بھی ویسے ہی بھاری تھے اور ان میں جھلکنے والی روح ہزار پردے میں رہتی تھی۔

وہ میرے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔اب مجھے غزل سنانا مشکل ہو گیا۔قافیے سامنے لکھ کر غزل بنانے کا عمل آوردی تھا۔ایسی جوڑ توڑ والی غزل اس غزال کو سناتے ہوئے شرم سی محسوس ہوئی۔

سنایئے ناں۔

کیا سناؤں جی معمولی سی کوشش ہے۔

کیوں کسر نفسی سے کام لے رہے ہیں؟ مجھے آپیا نے پہلے آپ کی اظم سنائی تھی۔

کون سی اظم۔

جلترنگ.....اقبال نے مسکرا کر کہا۔اچھی اظم تھی۔غزل سنایئے ناں۔

میں نے مطلع پڑھا تو غسل خانے کا دروازہ کھلا۔آپیا بالوں کو تولئے میں لپیٹے ننھی

بوندوں کو چہرے پر سجائے برآمد ہوئی۔

ہاں ہمایوں؟

رفعت آپیا یہ آپ کو اپنی غزل سنانے آئے ہیں۔

ہاں تو سناؤ ناں ہمایوں۔

میں نے پھر مطلع پڑھا تو دونوں نے بڑی داد دی۔ میں اقبال کو فاصلے سے دیکھتا رہا۔ وہ مالی طور پر ہم سے بہتر تھی اور اس کا چلنا پھرنا اٹھنا بیٹھنا ظاہر کرتا تھا کہ وہ افسر کلاس میں بڑھی پلی تھی۔ دوکانداروں، چھوٹے تاجروں، کلرکوں، کارندوں سے اسے دور کا بھی واسطہ تھا۔ وہ سرکاری افسروں کے کلچر کی آئینہ دار تھی۔

میں نے ساری غزل لہک کر ترنم کے ساتھ سنائی اور بعد میں اس بات پر خود حیران رہ گیا کہ اتنی بڑی شہزادی کے حضور میں نے اتنی جرات کیسے کی؟

جتنی دیر میں غزل سناتا رہا، وہ دونوں چپ چاپ بیٹھی سنتی رہیں۔ پھر اپنی باتوں میں مشغول ہو گئیں۔ کچھ دیر میں سمجھ نہ پایا کہ مجھے بیٹھے رہنا چاہئے کہ چلے جانے میں بہتری ہے۔ کپڑے لٹے گوٹے کناری میک اپ کے سامان میں وہ اس قدر کھو چکی تھیں کہ انہیں بھول گیا، کوئی ان کی تعریفی بارش کا منتظر ہے۔

گرمیاں کچھ تیزی دکھا رہی تھیں۔ رات کے قوت ہم بہن بھائی گھر کے دالان میں چارپائیاں بچھا کر پیڈسٹل فین کی ہوا میں سوتے تھے۔ ہر ایک کی کوشش ہوتی کہ اس کی چارپائی عین پنکھے کے سامنے ہو۔ امی ابو اندر ہی سوتے تھے۔ اندر والے پنکھے کے بیرنگ خراب تھے۔ ساری رات اس سیلنگ فین کی گھر گھر گھپ..... گھر گھر گھپ سنائی دیتی، چونکہ آپیا کی شادی قریب تھی۔ اس لئے اس نے ہر معاملے میں اپنے خصوصی حقوق کو منوانا شروع کر دیا تھا۔ ایسے ہی جگے ٹیکس میں اس کی چارپائی پیڈسٹل فین کے سامنے پہلی ہوتی۔ دن بھر یہ چارپائیاں اور فین آنگن میں پڑے رہتے۔

سہ پہر کا وقت تھا۔

میں چار پائیوں کی لمبی قطار میں آپیا کی چارپائی پر بیٹھا تھا۔ نہ جانے باقی سب کہاں تھے کہ اپنی سفید مورس میں اقبال آگئی۔ اس کے آنے سے پہلے میں نے اس کی اونچی ایڑی کی ٹک ٹک سن لی تھی۔ اس آواز نے میرے دل میں خلل امن پیدا کر دیا۔ شاید اسی لئے ایڑیوں کو یوں ٹھونک ٹھا نک کر چلنا منع تھا۔

وہ میرے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ میں نے خوفزدہ کبوتر کی طرح آنکھیں چرانے میں عافیت سمجھی اور پیڈسٹل فین پر نظریں جما دیں۔

السلام علیکم جی

اس جی میں پورے سات سر تھے۔

وعلیکم السلام

میں نے جواب دیتے وقت اس کی جانب دیکھا۔ اس نے فٹ فتی پہن رکھی تھی، جس کے بازو جالی سے بنے تھے اور سڈول بازو سفید سنگ مرمر سے تراشیدہ نظر آتے تھے۔ کندھوں پر چنت کیا ہوا دوپٹہ موٹے رسے کی طرح لاپرواہی سے پڑا تھا۔ سینڈل سفید پلاسٹک کی تھی جو شیشے کی طرح شفاف تھی۔ کبوتری کے پاؤں اس موتی جڑے سینڈل میں اور بھی سڈول ہو گئے تھے۔

تمہیں پتہ ہے بغیر لائسنس کے اسلحہ لے کر شہر میں پھرنا ممنوع ہے۔

موٹی موٹی آنکھوں پر بار بار پپوٹے پھڑکا کر اس نے پوچھا۔

جی..... میں سمجھی نہیں۔

تھری ناٹ تھری کا لائسنس لینا پڑتا ہے، ورنہ خلل امن کے تحت گرفتار کیا جا سکتا ہے۔

آپ اتنی مشکل مشکل باتیں اور ایسے ثقیل الفاظ کیوں استعمال کرتے ہیں۔

اس لئے مس اقبال میرا دادا مدرس تھا۔ وہاں گاؤں میں ہمارے گھر میں دادا جی کی پوری لائبریری تھی۔ ہم سارے بہن بھائی ان کتابوں کی ورق گردانی کرتے رہتے

تھے۔کچھ حصہ کتابوں کا تو ابا ساتھ بھی لے آئے تھے۔

شاید وہ میرا اشارہ سمجھ چکی تھی، پر تجاہل عارفانہ کی کٹاری استعمال کرتے ہوئے اقبال بولی۔وہ ابھی آپ ہتھیاروں کی بات کر رہے تھے۔میں سمجھی نہیں۔

آپ کو اپنی تلوار نیام میں رکھنی چاہئے۔کچھ پبلک نہتی اور خوفزدہ ہوتی ہے۔ایویں فساد پھیلتا ہے۔

میں کیا کروں؟

یا تو آپ کھدر کا کھلا چولا پہنیں یا پھر برقعے سلوائیں اور کچھ نہیں تو چادر میں لپٹی لپٹائی آیا کریں ورنہ تو معصوم لوگوں کا بہت نقصان ہوگا..... ویسے تو آپ کو ہاتھوں پر بھی دستانے اور پیروں میں بھی جرابیں پہننی چاہیں۔میں نے شرارت سے کہا۔

میں آپ کو بتاؤں..... کہ معصوم لوگوں کو چاہئے کہ وہ نگاہیں نیچی رکھیں اور ایک نظر غلط کے بعد گھورنے پر مائل نہ ہوں۔

واہ واہ.....اب تو آپ بھی اردو میڈیم کی پڑھی ہوئی لگتی ہیں۔ذرا بھی مشنری سکول کی پڑھی ہوئی معلوم نہیں پڑتیں۔

صحبت کا اثر ہے۔

کس کی؟

وہ مسکرائی اور خوش دلی سے بولی آپیا کی اور کس کی۔

جب آپیا کی شادی ہوگی تو پھر آپ آیا کریں گی۔ادھر ٹمپل روڈ۔

لیں خواہ مخواہ.....پھر یہاں آ کر کیا کرنا ہے۔

کرنا تو کچھ نہیں پر آتے جاتے رہنا ہے۔

وہ ہنس دی۔

اس کی ہنسی میں کچھ چھوت کے جراثیم تھے۔میں بھی ہنسنے لگا۔ہماری ہنسی کے جلترنگ کو سن کر میرے دونوں چھوٹے بہنبھائی آ گئے۔نہ جانے وہ اس سے پہلے کہاں

تھے۔فرید باور ظفر کی آمد مجھے ناگوار گزری،لیکن ان کا آنا ہی اقبال کے قیام کا باعث بنا۔

آپیا کہاں ہے۔

آپیا تو امی کے ساتھ ڈبی بازار گئی ہیں۔

اقبال نے ہاتھ اٹھا کر ماتھے کو چھوا۔آپیا سے کہا بھی تھا کہ مجھے ذرا دیر ہو جائے گی ذرارک جاتیں تو کار پر چلے جاتے.....اس کی آواز میں عجیب سا تاسف تھا۔

ان دنوں ہمارے پاس کار نہیں تھی اور سفید مورس ہم سب کے نزدیک امیری کی انتہا تھی۔ڈرائیور والی کار تو ویسے بھی لاہور کی سڑکوں پر کم کم دکھائی دیتی تھیں۔

الھڑ فریدہ کو ان دنوں لوڈو کھیلنے کا خبط تھا۔وہ دو چوٹیاں کر کے اپنے آپ کو مرلین منرو سمجھتی تھی۔

آپ لوڈو کھیلیں گی باجی اقبال۔

کیرم کھیلیں باجی؟ دسویں کے نوجوان ظفر نے سوال کیا۔

تب کلچرڈ ظاہر کرنے کے لئے ان ڈور گیمز بھی وصف شمار ہوتی تھیں۔ابھی ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ نے ٹیک اوور نہیں کیا تھا۔وقت کو گزارنے کے تفریحی مشاغل سادہ تھے۔

نہیں بھئی مجھے دیر ہوتی ہے۔

میں یکدم جھلس گیا۔

اور وہ جو آپ ڈبی بازار میں آپیا کے ساتھ گھنٹوں صرف کرتیں ہیں تب دیر نہیں ہوتی .....میں چڑ کر بولا۔

چلو لوڈو سہی۔

فریدہ اور مجھے پارٹنر بنا کر ظفر کے ساتھ اقبال لوڈو کی بازی پر بازی جیتتی چلی گئی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب بہنوں کی سہیلیوں کے ساتھ کیرم،لوڈو یا تاش کھیلنے پر اعتراض تو

تھا، لیکن والدین چپ رہا کرتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد ایک عجیب رنگ سوسائٹی تشکیل پا رہی تھی۔ لوگ باگ اپنے خاندانوں سے کٹ کر اجنبی لوگوں سے ملنے پر مجبور تھے۔ اکا دکا ان شادیاں خاندان سے باہر ہونے لگیں تھیں۔ اونچی جاتی کے لوگ جیسے خطرہ محسوس کر رہے تھے اور ان کی ٹولیاں آپس میں بیٹھ کر شیخیاں بگھارنے، ماضی کو یاد کرنے اور اپنے آپ کو افضل سمجھنے میں وقت گزارا کرتے تھے۔ شیخی اور پدرم سلطان بود دراصل خوف کے باعث پیدا ہوا تھا۔ کہیں اندر ہی اندر یہ اونچی ذات والے اپنی سلامتی کو Threatened سمجھنے لگے تھے۔ انہیں احساس تھا کہ مختلف النوع قسم کی آبادی ان کی قلعے بند روایات کو توڑنے کی طاقت رکھتی ہے۔ ایسے لوگوں کی اولاد تعلیم کی خاطر نئے میل جول اختیار کرنے پر مجبور تھی۔ لمبا ٹوپی والا برقعہ دولخت ہو چکا تھا اور کوئی کوئی گھرانہ صرف چادر کے سہارے چلنے لگا تھا۔ ہمارے ٹیپل روڈ پر Nuns والے کالے برقعے عام طور پر نظر آتے تھے۔ محلے میں عورتوں کا میل جول کم کم تھا، چونکہ عورت ہی عموماً رشتے ناطے مستحکم کیا کرتی تھی۔ اس لئے جہاں تک میل ملاقات کا تعلق تھا یہ عہد بڑوں کے لئے نئے خوف اور سوچ لیکر آیا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ہمارے والدین اور دادی دادی ہمیں زیادہ منع کرنے کے عادی نہ تھے۔ ان کی محبت میں چشم پوشی کی روایت گہری تھی۔ وہ مثال سے سکھانے کے عادی تھے۔ بچوں کو مذہبی درس اور اخلاقیات زبانی کلامی سکھانے کا رواج تھا۔ نوجوان عموماً گھروں کو دیر سے لوٹتے، لیکن ان کے لئے کنڈیاں کھول دی جاتیں۔ کھانا رکھ دیا جاتا اور ان کی آوارہ گردی پر نہ تو تبصرہ ہوتا نہ ہی پوچھ گچھ۔ بس لڑکا خود بخود ہی کہیں پہنچ کر سمجھ جاتا، سارے میں خبر ہو جاتی، اگر اس کی بے راہی روی کی داستان پھیل جاتی تو شادی کا ٹوٹکا آزمالیا جاتا۔ اللہ اللہ خیر صلاح ..... لڑکیاں میٹنی شو رد یکھنے تک آوارہ تھیں۔ کبھی کبھی انہیں عشقیہ خط بھی مل جاتے، گھرانے کا لڑکا ہوتا تو چوری چھپے کی ملاقاتیں بھی چل نکلتیں، لیکن یہاں بھی بڑے بزرگ جان بوجھ کر انجان بنے رہتے۔ نہ

تو ہم عمروں میں زیادہ مباحث ہوتے، نہ ہی بڑے اونچی آواز میں نوجوانوں کو گفتگو میں گھسیٹتے۔ یہ چشم پوشی کا عہد تھا صابرین اور شاکرین کا زمانہ تھا۔ خوف میں اندر اندر پکتے رہنے کا عہد تھا۔ خوف میں تو ہر زمانے کے والدین لرزتے ہی ہیں، لیکن اب خوف ترقی کا ہے۔ اب والدین، بڑے بزرگ اولاد کی مالی حیثیت اس کے سٹیٹس کے لئے متفکر ہوتے ہیں، کردار کے لئے نہیں۔

اسی لئے جب ہم چاروں گھر پر بڑوں کو نہ پا کر لوڈو کھیلنے لگے تو ہمیں چوری کی سی لذت محسوس ہوئی۔ ہمیں لگا جیسے ہم بڑوں کا منہ چڑا رہے ہوں۔ اقبال گو میری پارٹنر نہ تھی، لیکن مجھ سے اتنی قریب تھی کہ جب کبھی میں اپنا پاؤں یا گھٹنا ہلاتا، اس کی ریشمی ٹانگ سے ضرور ٹکرا جاتا۔ ہم دونوں سوری کہہ کر گوٹی پر چھلانے میں مصروف ہو جاتے۔ اقبال کے چہرے پر ہلکی سرخی دوڑ جاتی اور مجھے بھی احساس ہوتا کہ لمحوں میں کچھ ہونے والا ہے۔ ظفر نے اٹھ کر گراموفون لگا دیا۔ کندن لعل سہگل کی آواز سے کمرہ لہک اٹھا۔ نہ جانے کیوں مجھے لگا جیسے میں ہی دیوداس ہوں اور میں ہی لگا رہا ہوں۔ دکھ کے اب دن بیت نا ہیں۔

شاہد بھائی دو تین بار اندر آئے۔ انہوں نے ہمیں کھیلتے دیکھا۔ کوئی کمنٹری نہ کی۔ وال کلاک کا وقت ٹھیک کیا۔ سڑک کی طرف کھلنے والی کھڑکی کھولی باہر جھانکا اور گپ چپ باہر چلے گئے۔ وقت سست رفتار تھا۔ تب دو بھائیوں کے درمیان ایک لڑکی بہت بڑا رخنہ پیدا نہ کر سکتی تھی۔ بھائیوں کی محبت اپنی جگہ قائم رہا کرتی۔

بوڑھا آدمی ہمیشہ دائرے کا سفر کیا کرتے ہیں۔ انہیں بار بار ایک ہی بات دہراتے رہنے کی عادت بھی اسی لئے پڑ جاتی ہے اور وہ ماضی کی سوچوں کا سفر اسی لئے چھوڑ نہیں پاتا۔

ایجادات ہمیشہ سے ماحول پر اثر انداز ہوتی رہی ہیں۔ ان کو مشہور کرنے والے سلوگن بھی کچھ کم اہم نہیں ہوتے۔ مجھے یاد آیا کہ ایک بار میں لندن کی نیشنل گیلری میں

ٹرافالگر سکویئر گیا تو مجھے ہنر ماسٹرز وائس کی اصلی تصویر دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ گو اتنے برس گزر جانے کے بعد جب گراموفون ہی ایک عجوبہ روزگار بن چکا ہے۔ اس پر چھپی ہوئی کتے کی تصویر کس کو یاد ہوگی؟

لیکن ایڈیسن کا نام ابھی لوگوں کو بھولا نہیں۔ جو تصویر گراموفون پر بنی ہے، اس کی ایک لمبی ہسٹری ہے۔ فرانسس براڈ کے پاس ایڈیسن کی اولین ساختہ مشین تھی۔ اصل میں براڈ کا کتا Nipper جب بھی فونوگراف پر براڈ کی اصلی آواز سنتا۔ حیران سا رہ جاتا کہ مشین سے کیسے اس کی مالک کی آواز آ رہی ہے۔ اسی کتے کی وجہ سے ہنر ماسٹرز وائس کا مشہور عالم ٹریڈ مارک وجود میں آیا۔

براڈ اپنی تصویر بنا کر مختلف پبلشروں کے پاس گیا، لیکن کسی نے بھی اسے گھاس نہ ڈالی۔ دل شکستہ آرٹسٹ نے یہ ایڈورٹائزنگ پوسٹر اپنے سٹوڈیو کے کسی کونے میں ڈھیر کر دیا۔ کچھ سال گزر گئے۔ اب ایک گراموفون کمپنی نے ایڈیسن کے گراموفون کا تازہ ماڈل بنایا جس پر ڈسک ریکارڈ بجتے تھے۔ جس وقت براڈ نے پیتل کا ہارن دیکھا، اسے اپنی تصویر کو دوبارہ بنانے کا خیال آیا۔ وہ گراموفون کمپنی میں پہنچا اور آرزو ظاہر کی کہ ایک دو دن کے لئے اسے ہارن مستعار دے دیا جائے، تاکہ وہ تصویر میں کچھ تبدیلیاں لا سکے..... کمپنی مینجر کو اس وقت خیال سوجھا۔ اس نے براڈ کی تصویر دیکھ کر اندازہ لگایا کہ اگر فونوگراف کی جگہ ڈسک مشین بنا دی جائے تو پھر وہ اسے اپنے ٹریڈ مارک کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔ 1899ء میں اس ہنر ماسٹرز ٹریڈ مارک کو گراموفون کمپنی نے سو پونڈ معاوضے کے عوض خرید لیا۔ جب گراموفون کمپنی امیر ہو گئی تو انہوں نے براڈ کو سالانہ ڈھائی سو پونڈ ادا کرنا شروع کر دیا اور اس طرح بڑھاپے میں براڈ جیسا آرٹسٹ غریبی، بیماری اور بے روزگاری سے بچا رہا۔

حالیہ ترقی کے دور میں ایسے سلوگن اور ٹریڈ مارک کم ہوتے جاتے ہیں، جن میں کتا اپنے مالک کی آواز سن رہا ہو۔ اب اشتہار کے لئے موما عورت کی جنسی کشش کا سہارا